(74)

# تمام بدیوں سے بچنے کا طریق

(فرمودہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء بمقام لندن)

تشہد و تعوذ اور سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

سورۂ فاتحہ ایک عجیب نکتہ ہم کو بتاتی ہے۔ اور وہ نکتہ ایسا اہم ہے کہ اگر اس کو لوگ نظر کے نیچے رکھیں۔ اور اس کی حقیقت کو عملاً نظرانداز نہ کریں۔ تو ان کی زندگیوں میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک جس قدر عملی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس نکتہ کے نہ سمجھنے اور یاد نہ رکھنے کی وجہ سے ہوتی ہیں میں جہاں تک خیال کرتا ہوں۔ جب کبھی انسانی اعمال میں کوئی ایسی بات پیدا ہوتی ہے۔ جو منشاء الٰہی اور تقدیر کے خلاف ہوتی ہے۔ تو اس کا موجب یہی ہوتا ہے کہ وہ اس نکتہ کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اور یہ فیصلہ کرلیتا ہے۔ کہ میرے لئے اس پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اور وہ بغیر کسی قسم کے پس و پیش کے اس فعل کو کر گذرتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ غور کرلیتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔ اس لئے میں اسے لوں یا نہ لوں۔ بلکہ اسے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس کی راہ میں آنے والی چیزیں آپ ہی حل ہو جاتی ہیں۔ اور جس قدر اعمال وہ کرتا ہے۔ خود بخود ان کا فیصلہ دماغ کرتا چلا جاتا ہے۔ البتہ ان امور کے متعلق بے شک سوچتا ہے۔ جن کی طرف اسے میلان نہیں ہوتا یا جن کے فوائد اس کی نظر میں ظاہر نہیں ہوتے۔ لیکن جن امور کی طرف میلان ہو جاتا ہے۔ یا جن کے فوائد اس کی نظر میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کا فیصلہ اتنی جلدی اس کا دماغ کر دیتا ہے۔ کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس نے اس کے متعلق سوچا ہے یا نہیں۔

مثلاً ایک شخص چوری کرنے کا عادی ہے۔ جب اسے موقع ملتا ہے۔ فوراً ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ چوری کرنا بری بات ہے۔ خدا نے منع کیا ہے۔ لوگ برا سمجھتے ہیں۔ اور پکڑا جانے پر سزا ہوتی ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے جب اسے موقعہ ملتا ہے وہ رکتا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

پہلے پہل جب اس نے چوری کی تھی تو کچھ شک نہیں سوچ کر کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے نقصان ہو گا۔ اور اگر پکڑا گیا۔ تو سزا اور بدنامی بھی ہو گی۔ مگر میلان ایسا تھا اور ضرورت ایسی تھی کہ کسی طرح پوری ہو اور پھر وہ پکڑا نہ گیا۔ اس سے اس نے نتیجہ نکال لیا۔ کہ ہر چوری ایسی نہیں ہوتی کہ انسان پکڑا جائے۔ اور اس چوری سے اس کی ضرورت موجودہ کسی حد تک رفع ہو گئی۔ پس اس نے اس سے یہ فیصلہ کر لیا کہ چوری ٹھیک ہے۔ جب موقعہ ملا۔ ان خیالات نے تحریک کر دی اور اس نے ہاتھ ڈال دیا۔ غرض پہلی دفعہ اس نے جو جرأت کی تھی۔ تو اس وجہ سے کہ ضرورت ایسی ہی تھی۔ اس لئے یہ سمجھ کر کہ گو خدا کا حکم نہیں ہے۔ مگر اپنی ضرورت کو مقدم کر کے اس نے وہ فعل کر لیا۔ اور اس کے ان نتائج کو دیکھ کر دوبارہ غور کرنے اور فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ یہ کیوں ہوتا ہے! اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ اور اس عمل کے پیچھے ایک ہی خیال ہے کہ اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ گو یہ بھی ممکن ہے کہ بار بار کے فعل کے بعد یہ سوال ضرورت کا بھی پیدا نہ ہو۔

جس قدر بھی بدیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اسی خیال سے پیدا ہوتی ہیں کہ یہ چیز سب سے زیادہ ضروری ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں کیا ہی عمدہ طریق تمام بدیوں سے بچنے کا بیان کیا ہے۔ اور اسی کو مد نظر نہ رکھنے یا نہ سمجھنے کی وجہ سے انسان ان غلط کاریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ طریق اور فیصلہ الحمد للہ رب العالمین کے الفاظ میں ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں۔ رب العالمین یعنی تمام زمانوں کا رب ہے۔ انسان کی تمام حالتوں اور وقتوں میں اس کی طرف سے ربوبیت ہوتی ہے۔ کوئی زمانہ ہو۔ ماضی ہو' حال ہو' مستقبل ہو۔ ہر زمانہ میں وہی رب ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت تمام تعلقات کو چسپاں کر لو۔ کوئی ہستی بھی ظاہری طور پر بھی اور حقیقی طور پر بھی کامل حمد کی مستحق نہیں۔ عام سلوک کے معاملات تو صاف نظر آتے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ مگر دنیا کے تمام رشتوں میں یہ امکان نظر آتا ہے کہ زید مستحق ہے یا بکر۔ میاں بی بی شادی کرتے ہیں۔ میاں کے ذمہ ہے کہ بیوی کی ضروریات اور اخراجات کا انتظام کرے۔ اور اس کی عصمت کی حفاظت کرے۔ اور اسی لحاظ سے مرد قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ مگر بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مرد بڈھا ہو جاتا ہے۔ اور بعض ایسے امراض کا نشانہ بن جاتا ہے کہ حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں عورت محنت و مشقت کر کے کماتی اور اس کی خدمت کرتی ہے۔ قادیان میں ایک بڈھا ہے۔ اور گنٹھیا کی وجہ سے لاچار ہے۔ بارہا اس کی بیوی میرے پاس آتی ہے کہ اس کی مدد کی جاوے اس سے معلوم ہوا کہ بے شک خاوند محسن ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات حالات بدل جاتے

ہیں۔ اور عورت محسن ہو جاتی ہے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ ہستی حمد کی کامل مستحق نہیں ہو سکتی۔ جس میں کمزوری کا امکان ساتھ لگا ہوا ہے بلکہ کامل تعریف کی مستحق وہی ہو گی جس میں کبھی اور کسی حال میں بھی کوئی کمزوری واقع نہیں ہوتی۔

اسی طرح نوکر کی مثال ہے دنیا عرفاً سمجھتی ہے کہ آقا کو نوکر پر فضیلت ہے۔ گو میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ بجز حکم دینے کے کیا فضیلت ہے۔ آقا روپیہ دیتا ہے۔ نوکر اس کے بدلہ میں کام اور محنت کرتا ہے۔ اپنا وقت اور جسم دیتا ہے۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نوکر ادنیٰ اور آقا اعلیٰ ہے۔ اور اس لئے مستحق تعریف ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چور آتا ہے اور وہ حملہ کرتا ہے۔ نوکر اپنے آقا کی جان اور مال کی حفاظت کے لئے لڑ کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ اس وقت لوگ نوکر کی تعریف کرتے ہیں کہ ایسا وفادار ہے کہ اس نے آقا کے لئے لڑ کر جان دے دی اس حالت میں نوکر حمد کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ پولیس یا فوج میں نوکر رکھتی ہے۔ مگر وہ لڑائی میں مر کر جب جان دے دیتے ہیں۔ تو سپاہی قابل تعریف اور قابل عزت ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ کے لحاظ سے دیکھو۔ گورنمنٹ ان کو کیا دیتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے بیوی بچوں کو مربعے یا جاگیر دے دی۔ مگر اصل مرنے والے کو کیا فائدہ ہوا۔ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس لئے بہر حال حمد سپاہی کی ہو گی نہ گورنمنٹ کی۔

غرض جس قدر ان معاملات پر غور کریں۔ اسی فیصلہ کا امکان رہتا ہے کہ مستحق کون ہے مگر خدا تعالیٰ کے معاملات میں یہ امکان نہیں رہتا۔ وہاں یہ فیصلہ شدہ امر ہے کہ خدا ہی کی حمد ہے۔ اور وہی کامل حمد کا مستحق ہے۔

اگر کوئی شخص خدا کے لئے جان دیتا ہے۔ تو وہ جان دے کر اس کے فضل کو پہلے سے زیادہ پاتا ہے۔ اور اس کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ آقا' دوست' بیوی' کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ تیری خاطر ہم نے جان دی ہے۔ مگر خدا کے لئے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس کے فضل کے ہم بہر حال محتاج ہیں اور اس کی ربوبیت ہر حالت میں ہم کو مطلوب ہے وہ رب العالمین ہے۔ اور اس کی ربوبیت کا سلسلہ بدستور ہے۔ جس کے بغیر ایک لحظہ بھی ہم زندہ نہیں رہ سکتے اور مرنے کے بعد اس کی ویسی ہی ضرورت باقی رہتی ہے۔ تین زمانے ہیں ماضی حال اور مستقبل تینوں پر غور کرو کہ ربوبیت کی کیسی ضرورت ہے۔ اور بغیر اس کے گذارہ ہی نہیں۔

مثلاً انسان بننے سے پیشتر ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ نباتی یا حیوانی حالت ہوتی ہے۔ اس حالت

میں بھی ربوبیت اگر ساتھ نہ ہو تو آگے ترقی اور بقا نہیں ہو سکتی۔ دوسرا ایک زمانہ یہ آتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہو کر روح پیدا ہوتی ہے۔ اور جو انسانی حالت میں ہوتا ہے تیسرا جبکہ روحانیت ہی کا تعلق ہوتا ہے۔

پہلا زمانہ ایک نباتی یا حیوانی صورت رکھتا تھا۔ دوسرا جبکہ جسم اور روح کا تعلق تھا۔ تیسرا جبکہ خالص روح ہو گا۔ ان سب میں اس زمانہ کی حسب حال ضروریات ربوبیت ہی پورا کرتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کامل حمد کا مستحق خدا ہی ہے نہ کوئی اور۔ پس جبکہ ہر زمانہ میں خدا ہی سے تعلق ہے۔ تو کسی قربانی کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے کرنے میں نقصان ہو گا۔

سب سے بڑی قربانی جان دے دینا ہے۔ یا جان دے دینے کے خوف سے مرعوب نہ ہونا۔ مگر حقیقت کیا ہے؟ کیا اس قربانی سے ہم نقصان اٹھاتے ہیں۔ یا ترقی کرتے ہیں۔ خدا کے لئے جان دے کر انسان خدا کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ پس کوئی زمانہ اور کوئی قربانی ہماری راہ میں روک نہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔ ۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی جان دے دینا ہے۔ مگر اس سے بھی حق ادا نہیں ہو جاتا کیونکہ جان بھی تو اسی کی دی ہوئی ہے۔ اگر جسم کو قربان کر دیتا ہے تو بھی روح باقی ہے۔ یہ تو ماضی کی بات ہے۔ اگر حال مراد لو تو یہ انسان کے اختیار میں کب ہے؟ اس کی موجودہ حالت اور بقا تو خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ موجودہ زندگی اس کے فضل کے ماتحت ہے۔ وہ شامل حال ہو تو زندہ رہے گا۔ پس موجودہ حالت بھی انسان کے قبضہ میں نہیں۔

اگر مستقبل لو تو جان دیتے ہی ابدی زندگی مل جائے گی اس میں بھی خدا کے احسان کا پہلو غالب ہے۔ پس الحمد للہ رب العالمین کے لفظ پر اگر غور کریں۔ تو تینوں زمانوں کی قربانی کام آتی ہے۔

بسا اوقات ڈاکٹر نہایت محبت اور محنت سے ایک شخص کے لئے دوائی بناتا ہے۔ اور اس کو خیال ہوتا ہے کہ اس دوائی سے فائدہ ہو گا اور وہ میرے اس احسان و مروت کی قدر کرے گا۔ لیکن مریض مرجاتا ہے یا وہ خود مرجاتا ہے۔ اور اس طرح اس قدر و قیمت سے محروم رہ جاتا ہے جو وہ اس دوائی کے بدلے میں پانے کی امید رکھتا تھا۔ اور وہ محنت کسی نہ کسی طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا کی ذات سے صحیح بدلہ ملنا یقینی ہے۔ اور کسی صورت میں بھی وہ اخلاص اور محبت سے دی ہوئی

قربانی ضائع نہیں جاتی۔ جو خدا کی راہ میں کی جاتی ہے۔

مجھے بارہا خیال آتا ہے کہ گورنمنٹ اپنے وفادار اور جاں نثار لوگوں کو مربعے اور جاگیریں دیتی ہے اور وہ ان سے روپیہ کماتے ہیں۔ اور اگر کھانے کے شوقین ہیں۔ تو عمدہ سے عمدہ کھانے تیار کراتے ہیں۔ لیکن قے کا مرض ہو تو وہ کیا لطف اس کھانے کا اٹھا سکتے ہیں۔ یا کپڑے کا شوق ہو اور عمدہ سے عمدہ کپڑے تیار بھی کرالیں۔ لیکن اگر جذام یا کھجلی کی بیماری ہو جائے تو کیا فائدہ ہو گا۔ یا اگر سواری کا شوق ہے۔ اور عمدہ سے عمدہ گھوڑے موجود ہیں۔ لیکن اپاہج ہو جائے تو اس کو کیا لطف آئے گا لیکن اگر ایسے لوگ جو اپنی خدمات کو قربانی کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں زندہ بھی رہیں تو بھی گورنمنٹ یا کوئی اور ان کو حقیقی بدلہ نہیں دے سکتا۔ مگر خدا تعالیٰ کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ اس لئے اللہ کے لئے جو شخص کام کرتا ہے۔ وہ ضائع نہیں ہوتا۔

پس جب کہ یہ صورت ہے تو مومن کو چاہیئے کہ اس کی ساری قربانیاں خدا ہی کے لئے ہوں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے انعامات کا سلسلہ اور اس کے صحیح بدلہ کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ گورنمنٹ بھی بعض قربانی کرنے والوں کو وکٹوریہ کراس دے دیتی ہے۔ بیشک یہ ایک عزت اور انعام ہے مگر مرنے کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اور اس کا کچھ اثر مرنے والے پر نہیں رہ جاتا لیکن خدا کی طرف سے جو انعام مرنے والوں کو ملتا ہے۔ وہ غیر منقطع ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی عزت ہمیشہ کرتا ہے۔ ان کو حیات ابدی ملتی ہے۔ پس میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اسی ابدی زندگی اور دائمی عزت کے لئے کوشش کریں۔ اور اس کے لئے وہ اپنے اعمال میں اس نکتہ کو یاد رکھیں جو الحمد للہ رب العالمین میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کے فضل کے بغیر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

بچپن میں ہم ایک کہانی پڑھا کرتے تھے۔ میرے دل پر اس کا بڑا اثر رہتا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک شخص تھا۔ اس کی زمین سے بہت غلہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ بڑے شوق اور خوشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور چائے پینے لگا تھا کہ نوکر نے آکر کہا۔ کھیت میں سور آگیا ہے۔ اس نے چائے کی پیالی رکھ دی اور کہا کہ سور کو مار کر آکر پیوں گا۔ مگر سور نے ایسا حملہ کیا کہ وہ مر گیا۔ اس لئے یہ ضرب المثل رہ گئی۔

پس میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ خدا اللہ تعالیٰ کے لئے قربانی کریں۔ ہمارے سامنے مثالیں موجود ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ہماری جماعت کو خالی نہیں رکھا۔ ہم کو ایسے ملک میں پیدا کیا جہاں قتل اس طرح پر نہیں ہوتے۔ مگر خدا تعالیٰ نے ایسے ملک میں بھی ہماری جماعت کو پیدا کر دیا۔

جہاں قتل ہوتے ہیں۔ اور اس طرح پر ٹریڈیشن کو قائم کر دیا۔ ٹریڈیشن بڑا کام کرتی ہے۔ اور اس کا بڑا اثر ہوتا ہے اس سے جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتداً مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن جو شخص پہلے جاتا ہے۔ وہ راستہ کھول دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے لئے راستہ کھل گیا ہے۔ افغانستان کے بعض دوستوں نے اس راستہ کو کھولا ہے۔ انہوں نے خدا کے لئے موت کو آسان کر دیا ہے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ خطرناک راستہ میں اگر ایک چل پڑے تو سب چل پڑتے ہیں۔ پہلے ہی کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح اس راستہ کو ہمارے دوستوں نے آسان کر دیا ہے۔

بعض تقویٰ اور علم کے لحاظ سے کم سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً نعمت اللہ ایک طالب علم تھا۔ اور اسے دراصل وہاں جماعت کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مگر بعد میں اس کو مبلغ مقرر کر دیا گیا اس نے اپنی جان دے کر ثابت کر دیا کہ خدا کی راہ میں قربانی کرنا اس کے لئے بہت آسان تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے لئے اس راستہ کو جان دے کر کھولا ہے۔ تو کیا اب وہ جو اس کے استاد تھے یا جن کے ہاتھ میں اس مدرسہ کا انتظام ہے۔ نہیں سوچیں گے کہ جب وہ قربانی کر سکتا ہے تو کیوں ہم قربانی نہیں کر سکتے۔ اس کی قربانی نے تو اس مرحلہ کو آسان کر دیا۔ اس لئے کہ پچھلوں نے دیکھ لیا کہ خدا کی راہ میں مرنے والوں کی کیا عزت ہوتی ہے۔ آج تار آیا ہے کہ اس نے بڑی بہادری سے جان دی۔ اس کو اصرار سے کہا گیا کہ توبہ کر لو۔ مگر وہ چٹان کی طرح قائم رہا۔ پھر اس کو شہر میں پھرایا گیا۔ اور اعلان کیا گیا کہ اسے ارتداد کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔ اور چھاؤنی میں جا کر سنگسار کیا گیا۔ اب گورنمنٹ افغان کوئی اور حیلہ تراش نہیں سکتی۔ خود اس کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ میں جان دینا ادنیٰ قربانی سمجھتا ہوں۔ اعلیٰ درجہ کی قربانی وہ ہے۔ جس کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اشارہ کیا ہے۔

کربلائے است سیر ہر آنم<br>
صد حسین است در گریبانم

اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک جان دے دینے کے لئے تیار نہیں ہو جاتا۔ اس لئے پھر یہ ادنیٰ قربانی نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ ہو جاتی ہے۔ یہ مقام انہیں لوگوں کو ملتا ہے۔ جو اپنے عمل سے دکھا دیں کہ موت ان کی نظر میں حقیر ہے۔

ہماری جماعت کے لوگوں کو اس اعلیٰ شہادت کے لئے تیار رہنا چاہیئے میرا یہ مطلب نہیں کہ جنہوں نے جان دی ہے۔ ان کی قربانی حقیر ہے۔ وہ تو بہت بڑی قربانی ہے۔ کیونکہ انہوں نے راستہ کو

صاف کیا ہے اور اپنے عمل سے بتا دیا کہ موت کی کچھ حقیقت ان کی نظر میں نہیں۔ اور ان مرنے والوں کے لئے بڑا درجہ ہے کیونکہ انہوں نے شجاعت ایمان کا مقام پا لیا تھا۔ اور اس کا ثبوت انہوں نے جان دے کر دے دیا۔ غرض ہم کو اس مقام کے حاصل کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لئے قربانی کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ ہمیں توفیق دے۔ کہ اس کی محبت اور عظمت کے سوا اور کسی کی محبت یا عظمت ہمارے دلوں میں نہ رہے۔ آمین

(الفضل ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء)